

حمام سے جب نہاد صوکپڑے بدال بال جنگل کتی نخلی میں سمجھا برسات آگئی، ساون کی گھٹا چھاگئی۔ وہ بدن کیا تھا ایک بغیرہ تھا، گات ہری بھری، مگر بھری بھری، سینہ کنوں کے دو پھول پھولوں میں دو گلیاں، یا میں لچکتی ڈالیاں، رخسار شاداب، ہمونٹوں میں پھول کھلے ہوئے، انکھوں میں جو ہی بھولی ہوئی۔ میرے پورے کوں میں اور انگلیوں میں ہمچلیوں میں پورے بدن میں پھول کھل اٹھا اور اس تصویر سے کہ میں نے ابھی ابھی اس جسم کو چھووا ہے۔ دماغ عرش میں جھولنے لگا۔ وہ بعد تملکت آئی اور چھپر کھڑ پہ بیٹھ گئی۔

میں نے آخر ہفت کر مزاج پرسی کی بولی "اچھے ہوں، بدن قدرے دکھتا ہے، جی چنگنا ہے،" اور آہ سو بھر جب ہو گئی۔

پھر بولی "میں اعزیز جوان بتجھے جواہسان کرتا تھا کہ لیا۔ اب اپنی کڑیل جوانی پر حکم کر اور جلد اس سخوت بستی سے نعل جا۔ جانے کس گھر طای کس آن فرنگی فوج اس سخت سے پھر گزرے اور باقی رہی سمی جالوں کو ملیا میٹ کر دے۔"

میں آبدیدہ ہو بولا "میں اپنے رفیقوں سے بچھر ڈکر حڑاب پھرتا ہوں۔ اپنی زندگی سے بہت نگ آیا ہوں۔ اپنے شکر کی جستجو میں آوارہ بھرتا تھا کہ قدرت ادھر لے آئی میں نے اس محبت یک نفس کو غنیمت جانا تھیں یہ محبت ایسی ہی ناگوار ہے تو پاہی پھٹے ہی خوار اور جی جان سے بیزار....."

اس بات پر وہ خوش بخت گھر ائی اور بات کاٹ کر بولی "اے ہے اچھے ساہی ہو، فراسی بات پر ٹسوے بکھارنے بیٹھ گئے۔ بجھ کاں کھاتی نے تو تمہارے بھلے کو کہا تھا۔ اپنی جان کے ایسے ہی بیری ہوئے ہوا اور جان بوجھ کر ملا کت مول لیتے ہو تو شوق سے رہو؛" ابھی وہ یہ کہتی تھی کہ باہر اعلیے میں میرا گھوڑا زور سے ہمنا یا۔ میں چون کاک کوئی آفت آئی۔ جلدی سے اس گلشن خوبی کی کلامی پکڑی اور کھینچتا ہوا چلا کہ "دشمن آگیا۔ یاں سے چل نکلو،" ہمیں یوں جلتے دیکھ کر طو طا چلانے لگا اس کی آوازن کروہ مرطای اور بولی

”اپنے مٹھو کو چھوڑ کر کسی حال نہ جاؤں گی“، میں نے لپک کر بخرا بھایا اور اسے اسی طرح بھینچتا ہوا باہر لایا۔ بعجلت گھوڑے پر بٹھا، تجھے اسے بھایا، فرتاک میں بخبرے کو باندھا اور گھوڑے کو ایرڈ دی۔ رہوار سبک رفتار سرپٹ دوڑا اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

اب رات ہوئی تھی۔ چاندنی چھار طرف پھیلی تھی، ٹھنڈک بدن میں اترتی تھی۔ میری رائیں رہوار سبک رفتار کی زین پوش پشت سے چپاں ہوئی تھیں، میری پشت میں وہ ہر بھر سینہ پیوست ہوا تھا اور باہیں کمر میں تھیں اور میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کمر رہا تھا میں عرش میں جھوول رہا تھا۔ وہ رات میری شہسواری کا حاصل تھی، گھوڑے کی پشت بہشت بنی تھی اور ہم چاندنی میں نہائے ہوئے اوس اولاد خشکی میں بھیگے ہوئے، باہم چکے ہوئے اڑ سے چلے جاتے تھے تھے یوں لگا کہ میرا گھوڑا زیں کے سارے رستے طے کر کے کرہ ارض کو چلانگ لگا گیا ہے۔

قصہ مرتبان اور گاؤں سوار کا

رات گئے، ہم ایک بستی میں وارد ہوئے پوچھتے کچھتے ایک سرائے پہنچے کو ٹھڑی کرائے پہلی جس میں ایک چار پانی اور ایک میلا سال بستر پڑا تھا۔ اس پر آشوب وقت میں ہم نے اس کو نے کو بھی غنیمت جانا۔ بستر بچایا بھیر میں نے تلوار نیام سے نکال درمیان رکھی اور دونوں ایک دوسرے کی طرف پشت کر پڑا ہے۔

مگر میری آنکھوں میں نیند کھاں۔ کچھ بیتے ملحوں کی مرشاری کچھ قرب نما دوری کی بیقراری، بس ساری رات کروٹیں بدلتے کٹی۔ یوں کروٹیں بدلتا تھا کہ ناگاہ منہوس آواز کہ شتر نہ بارک میں تڑکے سنائی دیا کرتی تھی کان میں پڑی۔

طوطا بینا دمڑی جی

کوڑی پیسے دمڑی جی

راجا پر جا دمڑی جی

میں دہل گیا۔ یہ پر لیٹنا نی ہوئی کہ پھر لاکھ کروڑ میں بدیں نیند نہ آئی۔ بیقرار ہوا تھا، باہر نکلا۔ آسمان قدر سے اجل گیا تھا۔ ستاروں کا قافلہ گزر گیا تھا، ستارہ سحری چمکتا تھا، رنگ قمری پھیکا ہوا تھا۔ اتنے میں مرغ کی بانگ بلند ہوئی اور دور کسی مسجد سے اذان کی صدا اٹھی۔ میں نے وضو کر خنوع و خشوع سے فریضہ سحری ادا کیا۔ پھر کوہ طڑی میں اگر اس گلشنِ خوبی کو جھینجھوڑا۔ وہ ہٹر بڑا کراچھی جلدی سے یعنی کوڈھار کا اور انگھیں ملتی نکھلتی سی میلے بستر سے اٹھی۔ منہ ماتھے دھویا، فریضہ سحری ادا کیا۔ پھر جملہ فرائض سے فارغ ہوا پی انگو محنتی آثاری کہ سونے کی بھتی اور عقیقیت اس میں جڑا تھا۔ مجھے دی اور کہا کہ بازار جا کر اسے فروخت کر اور کھانے پینے رہنے سمنے کا بندوبست کرے۔

میں بازار میں نکلا تو عجب ماجرا دیکھا۔ شہر شہرِ خوشاب بنا تھا۔ بازار کھلکھل کر تھا، خرید و فروخت ہوئی تھی۔ پر کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا۔ سودا سلف خریدنا اور چبپ چاپ گزر جانا۔ نہ ہنستا قہقہا نانہ بولنا چہکنا۔ میں دن بھر بازاروں میں گھومتا پھر اور نیز ظیع عجیب دیکھتا رہا۔ شام ہوئی تو دیکھا کہ کوچہ و برباد کے سب لوگ قافلہ در قافلہ خا موش اخاس شہر سے باہر جاتے ہیں۔ میرا ما تھا۔ ٹھنکا کہ شاید اس میں کوئی بھی بھیڈ ہے۔ تم بھی چلو اور قوتِ الہی کا نماش دیکھو۔ سو میں بھی تھی پیچھے ہو لیا۔

یہ پورا جمیع ایک ہی میلان میں قطار در قطار کھڑا ہو گیا، مگر اسی طرح صورت تصویر خاموش۔ دفتار کی نظر میں ایک سخت اٹھ گئیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک فرنگی گاؤں سوار ہے تھیں ننگی تلوار مرنے میں کف بھرے جوش و خروش کرتا چلا آتا ہے۔ پیچھے اس کے دوائلے بالوں دلے غلام ہیں کہ ان کے ہاتھوں میں بھی ننگی تلواریں ہیں۔ پیچھے ان کے ایک غلام پہاڑی ہے کہ بڑا سامرتباں کا ندی ہے۔ پہ دھرے چلا آتا ہے۔ وہ فرنگی قریب اگر بیل سے اتر ایک تخت پر دوڑا نہ ہو بیٹھا اور ننگی سیف سامنے رکھی۔ پھر غلاموں پہ زبان عجیب میں گرجا۔ وہ بیک جیک جمیع کی سخت آئے۔ غلام پہاڑی مرتبان سب کو دکھاتا جاتا تھا۔ دیکھنے

وائلے ہر اس سے دیکھتے تھے اور انکھیں بند کر لیتے تھے۔ ایک جوان مردنے مرتباں کو دیکھ کر نعرہ مارا اور آنکھیں اس کی مُرخہ رہ گئیں۔ اس پروہ فرنگی زبان عجیب میں پھر گردہ جا اور اسے بالوں والے غلاموں نے اس جوان مرد کو صفت سے الگ کر گردن ماری اور لاش کو تڑپتا چھوڑا۔ آنکھ کی صفت کے سامنے گئے ہیں سب سے آخر میں کھڑا بیہ ما جرا دیکھتا تھا کہ اتنے میں مرتباں میرے سامنے آیا۔ عجیب دروناک منظر دیکھا کہ کسی شہزادے کا سر ہے، زینب کالی کالی، صورت گوری گوری، تیوروں سے بچا عست پیکتی ہوئی، صورت ماہ دو ہفتہ مرتباں کی ظلمت میں چمکتا ہے۔ میرا لیکھ مرنے کو آگیا، آنکھوں میں خون اتر آیا، مگر مصلحت اسی میں دیکھی کہ فی الحال ضبط کر دو اور گھر چلو۔

میں نے لگھا کہ اس گلشن خوبی کو یہ ما جرا سایا تو وہ بے تابانہ میر سے گلے سے پیٹ گئی اور کاندھے پر صرد کھ کر بے سخا شارونے لگی، میں نے اسے سمجھایا، پچکارا، آنسو پوچھے، تسلی دی۔ وہ دیتک پچکیاں لیتی رہی، پھر وقت بھری آواز میں بولی «اے میرے جس تو جس شہزادے کا سر دیکھ کر آیا ہے وہ میرا ماں جایا ہے بیسم تم زده خلقت اسی بد نصیب بادشاہ کی ہے جس کی یہ دختر خس اختر ہے ماں جایا میرا ہنگام کا رذار میں مارا گیا مفرغیوں نے سراس کا تن سے جدا کیا اور مرتباں میں رکھا۔ باپ میرا زندہ کر فمار ہوا۔ اسے انہوں نے درخت سے لٹکایا اور زندہ جلایا۔»

میں نے یہ افسانہ جگر پاش سناتا انکھوں میں خون اترایا۔ مگر سمند خال آج تھما تھا، کیا کر سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ «اے شہزادی دیکھاری عنوں کی ماری، ہمارا یہاں قیام خوب نہیں۔ اس نگری سے نکل چلو اور کہیں دور ٹھکانا کرو۔۔۔»

کھانی شہر بے چہرے غم کی

میں نے جلدی جلدی گھوڑے کو کسا، گھوڑے پر اسے ساتھ بٹھا ایڑدی اور شہر سے

نکل کھڑا ہوا۔

ہرج مرچ کھینچتے ہوئے صعوبت سفر اٹھلتے ہوئے ہم چلے جاتے تھے کہ ایک شہر میں گزر ہوا۔ اس شہر کا عجائب طور دیکھا، عمارتوں اور عمارت والوں کا رہا اور پایا۔ جا بجا محلات و باغات شاہی مگر سب اجرٹے ہوئے اندر باہر لائشوں کے پیغمبر پڑپے ہوئے۔ عالی شان امام باڑے مثل جسد امام مظلوم زنجنوں سے چور، فیلو ایں گولیوں سے چلنی، تو پوں کے گراں سے بھبلتے ہوئے، گنبد کرے ہوئے۔ لوگ بیسر پوش، خاموش، لمب بند، خرمی صورت بناتے ہوئے زبان حال سے مرغیہ خوانی کرتے ہوئے۔ شام پڑتی تو لوگ اسی طرح خاموش لب بند اپنے اپنے گھروں کو چلے اور گلی کو چھوڑتے ہوئے لگئے۔ نہ کوئی دکان کھلی تھی، نہ مکان میں چراغ جلتا تھا پورا شہر اندھیرا تھا دن کی وہ صورت رات کی یہ کیفیت۔

میں سارے دن تماشی بنا یہ تماشائے غم دیکھتا رہا تھا، پر اب دامن صبیط ہاتھ سے چھوٹا تھا۔ بڑھ کر ایک بسے پوش بزرگ سے پوچھا «اے رفیق یہ کیا ماجول پے کہ موسم عز اگزد گیا مگر تمہارے شہر نے ماتھی بیاس نہیں آتا را۔ بہت سا تھا کہ اس شہر کے لوگ امام شہید کا سوگ بکمال نقادست و شاستری مناتے ہیں؛ عراخلنے آباد ہوتے ہیں۔ روشنیوں سے جگدا کاتے ہیں؟ امام باڑوں میں قندیلیں، مومن شمعیں، دعڑخے، جھاڑ فانوس، ہانڈیاں بیوں جگدیا کتی ہیں کہ سارے شہر میں ان سے روشنی پھیلتی ہے؛ گلی گلی بیلیں لکھتی ہیں، امام نشہ کام کی یادیں مشربت پلایا جاتی ہے۔ تو شہ بائیا جاتا ہے۔ بیسلوں پر خلقت کا اثر دہام ہوتا ہے۔ جیساں میں جمع خاص و عام ہوتا ہے۔ پر یہ کون سا موسم عزم ہے کہ عربا خانے ویران ہیں۔ امام باڑے سے سماں ہیں، گلیاں انڈھیری ہیں، شہر سمجھا پڑا ہے۔»

وہ سید پوش بزرگ یہ کلام سن آبیدہ ہوا اور آہ سرد بھر محو لا کہ «اے نہمان عزیز ایہ شہر بہت غارت زده ہے۔ ایام عز اکیوں تمام ہوں کہ لغزیے اب کی برس نہیں اٹھتے اور ماتھی پوشاک کیسے اترے کہ ہم اپنے جلا و طن پادشاہ کا سوگ مناتے ہیں اور شہر میں چراغ کیوں

کر جلے کہ شہر کا چراغِ ہماری ملکہ شہر سے باہر ہے۔

خود شید و دخشانِ امامت ہے سفر میں

گردشِ نظر آتی ہے اُسے دور قسم میں

اے عزیز توکس زمانے کا ذکر کرتا ہے۔ اب بیان کی زمین اور فلک اور ہوا کوچے بیرون
ہو گئے، الگیاں بکھر گئیں جو فیض کے دریا تھے خشک ہو گئے شہر پیاسا سا ہے۔ شہر کے چاند پہ
ظلم کی گھٹا چھاتی ہے، شہر اندر ہیرا ہے، طوفان پہ دوڑیں جلی آتی ہیں۔ مردان حرگز فشار ہوتے ہیں۔
اور گردن مارے جاتے ہیں۔ اے عزیز توکس موسم میں ہمارے شہر آیا، یہ دن وہ ہیں کہ ہمارا
شہر ویران ہے نیزی کیا خاطر کریں اور کیوں کمرحتی میزبانی کریں، ہماری ملکہ سفر میں ہیں شہر کی
شہزادیوں کی خوشبو سے جنگلِ مکھتا ہے، شہر ترستا ہے۔ گرمی کے دن اور پھارڈوں کی وہ راہیں
وہ گوری موسم میں سلو لازمی ہوں گی، چاند سی صحوت میں کجلا نہ گئی ہوں گی۔“

وہ مرد بزرگ ایک آہ بھر کر چپ ہو گیا۔ پھر سرگوشی میں گویا ہوا ”اے عزیز ہماری ملکہ پھارڈوں
میں مولا مشکل کتنا کا چلنے کیھنختی ہیں جب وہ چلنے پورا ہو جائے گا تو وہاں سے پلٹیں گی، باوشاہ
کو آزاد کرائیں گی اور ہمارے شہر کے دن پھریں گے۔“

یہ کہ وہ مرد بزرگ جلدی سے آگے بڑھ گیا اور ایک لگلی میں مرکر گم ہو گیا۔

یہ آہ سر دیجھرنا لکھ افسوس ملتا سارے کو واپس ہوا اور گلشنِ خوبی سے کھا کا۔ اے
لبی بی، ہم شہر مگ سے نکل کر شہر بے چراغ میں آتے ہیں۔ شہر والے شہر پاڑ کروتے ہیں اور ماں
بک شہر آزو کرتے ہیں۔“ یکی غبیت اس شہر کی سن کر اسے اپنا شہر پاڑا بیا اور بہت روئی۔

اے عزیز و باقیز و جب وہ گلشنِ خوبی روئی تھی تو میرے بد ان کے اندر رزمِ حاریں
سی چلنے لگتی تھیں۔ سپاہیاں زندگی کی بھاری فندہ اتر جاتی اور ہیں سراپا ایک دھڑکتا ہوا دل
ایک جمعیٰ پچھلتی کوئی جاتا۔ یکی غبیت آج تجھ پہ اس شدت سے طاری ہونی کہ بن بتائے نہ بنی۔
پڑیں نے اپنے دل کے حال کا اظہار بر ملا کر نامناسب نہ جانا اور یوں بہانہ بنایا کہ اے

نیک بخت، اس شہر متبرک میں اچھے ہمیں پہلی رات ہے۔ تیری پاک دامنی ثابت، تیری عصمت بنی مسلم
پر بندہ بشر ہے، برائی کا ہر گھر ہی ڈڑ ہے۔ بدی انسان کے خیر بیس داخل ہے اور خون بن کر
رگوں میں دوڑتی ہے۔ جب جسم جا گناہ ہے اور خون پکارتا ہے تو یہ تلوار کی گز بھر کی دیوار کیا کیا
چیز ہے۔ قبیلہ اور دین و ندہب کی استوار کی ہوتی دیواریں مثل حن اس کی رو میں بہتی دیکھی
گئی ہیں۔ کیا ستم ہے کہ دلوں میں وصل ہے اور جسموں میں فصل ہے جب دوری ہے تو یہ قرب
بکوں اور یہ قرب ہے تو دوری کیوں؟“

یہ کلام سن کروہ بہت بخوب ہوئی، چھرہ شرم سے گلبانی ہو گیا، منہ سے کچھ نہ بولی میں نے
دل میں اپنے تیس طامت کی کہ پہاہی زادے تلوار کے دار خوب جانتا ہے۔ محبت کے
راوی پیچ سے مخفی نا آشنا ہے۔ وار اوچھا پڑا، آخر چوتھ کھائی۔ میں ابھی سوچتا تھا کہ وہ
بے تباہ نہ میر سے گلے لگ گئی اور چکیاں لے رونے لگی۔ میں سمجھا کہ جنت مل گئی، گلے
نہیں لگتا، ہوں بہشت میں گلاشت کرتا ہوں سگر اس لے ایک اور پیچ ڈالا۔ بولی کرائے
میرے نہن تو نے یہ کیا سوال کر دیا اور مجھے آزمائش میں چنسایا میرے شہر کا سماں لٹ
گیا، میری جو بیکی کی آبروحت گئی، میں کیوں کرتخت عدوی پر بیٹھوں۔ میں نے یہ عمد کیا تھا کہ
اس سورما کی کنیز بنوں گی جو میرے باپ بھائی کے خون کا بد لئے اور میرے شہر کو بخوبی فرنگ
سے نکال لے۔“

اس کلام کو اس سے سن میری پہاہی نہ غیرت نے جوش کھایا، اپنا بھولا ہوا فریضہ یاد آیا،
بلو لا، اے نیک بخت تو نے میری آنکھیں کھوں دیں۔ بخت خاں نے مجھے نصیحت کی تھی کہ کہ
سندھ خاں فتنہ فرنگ کے خلاف امعنی ہوئی تلوار نیام میں نہ جائے گی۔ فرنگیوں کے جسم اس کے
نیام نہیں گے۔ میں اس قول کو شہستان محبت میں بھول چلا تھا تو نے مجھے یاد لایا اس میں
بخت خاں کی تلاش میں نکلتا ہوں کروہ مقرر شیر شاہی مینار کی تلاش میں ہو گا۔ جب فتنے کے
کی آواز تیرے کان میں آئے تو جاننا کہ تیرے باپ بھائی کے انتقام کا وقت آیا اور فتنہ فرنگ ملا،

وہ رات ہماری آخری رات تھی رات گئے تک پھر کی راتوں کی سرچتے رہے اور اُنے
واسے وصال کے محوں کی باتیں کرتے رہے۔ جانے کس وقت سوئے اور کیسے سوئے کہ دیا
میں نوار رکھنا بھی بھول گئے۔

سفر سرپہ سوار تھا۔ تڑ کے آنکھ کھل گئی۔ جانا کہ مس کا ایک ٹلسما تھا کہ ٹوٹ گیا۔ حلقہ کی سیر
کرتا تھا کہ زکار لایا۔ تاروں کی چھاؤں میں گھوڑے کو کسا، اس گلشنِ خوبی کو لے رکا یا اور گھوڑے پہ
سوار ہو سفر پہ چلا۔

شہر سے نکلا تو فخر، موچی تھی پر بادل چائے ہوئے تھے۔ پارش ہو چکی تھی، اب ترشی ہوتا
تھا مدد سے صدائی تھی:

ندی نزد اکا جل گر جے گر جے گنگا کی دھار
بر سات لگ چکی تھی۔ آج سادون کی پہلی بھڑی تھی۔ آخما دوں پڑھی جاتی تھی۔
سمند خاں یہاں تک سن کر خاموش ہو گیا۔ دیر تک اسی طرح وزرا نوبیخا رہا صورت
تصویر خاموش حاضر بن سکتے میں تھے پھر بولا "امے عزیز و بخت خاں ابھی زندہ ہے اور
شیرشا ہی مینار کی جستجو میں ہے جب تقارے کی آواز کاں میں آئے تو جانما کم بخت خاں
کے لشکر کے کوچ کا وقت آیا اور سمند خاں تمہاری گلی سے اٹھا،

سمند خاں جلدی سے اٹھا اور نظر لگاتا ہوا مطلب سے نکل گیا۔

ندی نزد اکا جل گر جے گر جے گنگا کی دھار

اس کے بعد ہم نے سمند خاں کو نہیں دیکھا۔

حکیم جی چبہ ہو گئے۔ عنی، صدیق، نصیر، عدالت علی بھی خاموش ہو گئے۔

پھر عنی نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا دکھا گیا وہ،

"اللہ جانے،" حکیم جی بولے "اللہ جانے کہاں گیا،" خاموش ہوئے، پھر بولے "اس
رات ہماری گلی میں بہت گرفتاریاں ہوئیں، میرے پاس بھی کوتواں آیا تھا، مگر اپنا شہر میں

اسپیار نخا سونچ گیا۔“

عدالت علی خاموش حق پیتے رہے۔ پھر نے حکیم جی کی طرف موڑ دی۔

غنی بولا «حکیم جی، بخت خاں بسچ پچ زندہ ہے؟»

حکیم جی نے نے کو ہونٹوں میں لیتے لیتے چھوڑا، لوئے کہتے یہی ہیں کہ بخت خاں اب تک زندہ ہے۔“

«مگر کیسے زندہ ہے؟ صدیق نے سوال کیا۔

حکیم جی بولے «دوستو، دنیا جہر کا کار خا نہ ہے۔ زندگی طلسہ ہوت رہا ہے، اس کا خانے کاراز کس نے پایا اور اس طلسہ کا بھید کس نے بُو جھا بیوں موت سے کسی کو رستگاری نہیں جو آیا ہے وہ جائے گا۔ پر قدرت کجھی کجھی یہ شعبدہ بھی دکھاتی ہے کہ موت کو زندگی کے مقابلے میں ہمارتی ہراتی ہے یوں سناء کہ جب بخت خاں دلی سے زکلا نخا تو ایک قریب سے گزرتے ہوئے ایک گھوڑے کی ہنمنلنے کی صدائے عجیب اس کے کان میں آئی تھی مگر اس نے اس صدای پر غور نہیں کیا اور آگے بڑھ گیا۔ تب ایک فیرا سے راہ میں ملا اور لفڑا «بخت خاں تیرا بخت بڑا ہو کہ ٹیپو کے گھوڑے کی صدائی نہیں سنی۔ تیری فتح کا وقت مل گیا۔ اب مگر دش دواراں تجھے دشت دشت آوارہ پھر لے گی اور پہاڑوں میں خراب کرے گی۔ پر تو اس آواز کے باعث موت کے چکر سے نکل گیا ہے کہ جب پھر یہ آواز کئے تو کان دھرننا اور اس سخت جانا۔»

غنی نے پوچھا «حکیم جی ٹیپو سلطان کے گھوڑے کی یہ کیا کہانی ہے۔ وہ قریب کو نساقیر یہ تھا۔ وہ آواز کیسی آواز تھی۔

حکیم جی بولے «دوستو یہ کہانی لمبی ہے اور رات چھوٹی ہے۔ مگر بارہ کا بسچ گا۔

پسند کا بلا واؤ آگیا۔ آج کی رات کے لئے یہ سبجا برخاست کرو جو۔

کل رات کو اب ختم یہ افسانہ کرنا گے

گھوڑے کی تدا

ایک دن و حوب تزٹا قے کی پڑی، دوسرا دن بادل گھر کر آئے اور برس پڑے، رات کو چار پاساں پھر اندر چل گئیں اور سونے والے منی کی راتوں میں چھتوں کے پنجے رفنا بیان تاں کر سوئے۔ موسم کا یہ فساد نصیر کی دلنشتی میں ایم ڈبم کا کرشمہ تھا۔ غنی کہتا تھا کہ موسم کسی ملک میں سدا ایک سے نہیں رہتے۔ صدیوں معملوں کا دوریوں چلتا ہے کہ کبھی نہیں ٹوٹے گا اور پھر لوٹ جاتا ہے مگر عدالت علی کے تینیں یہ قهر کی صورت تھیں۔ ایک ایم ڈبم چھوٹنے سے جاڑے کر می بر سات سب کا قربینہ بگڑا جائے۔ غفل نہیں مانتی۔، حکیم جی کہتے تھے ہے چلومن لیا کہ ایم ڈبم سے معملوں کا قربینہ بگڑا گیا مگر بجا تی آسمان پر یہ کیا ہو رہا ہے کبھی رات کو آسمان کی طرف بھی دیکھا کر وکہ وہاں ان دلوں کیا کرام پتا ہے۔ دم بدم تارے ٹوٹتے ہیں۔ کیا آسمان پر کسی نے ایم ڈبم چھوڑ دیا ہے، جب دمار ستارے کی خبر آئی تو ان کی دلیل کو اور تعقیب حاصل ہو گئی۔ «عدالت علی کو یاد ہونا ہو، ہم نے جاڑوں میں آسمان کو دیکھ کے کہہ دیا تھا کہ بھائی سن تاون آر رہے ہیں، آثار لپھے نہیں۔ چھلی رات کو مرتخی انکارے کی طرح دیکھتا تھا میاں، ہماری یہ عمر ہونے کو آئی کبھی، ہم نے مرتخی کو بیوں پھیلیتے دیکھا۔ وہ تو ایسے بھل رہا تھا کہ میں سمجھا سورج کے برابر ہو جائے گا۔ اب مرتخی میں ایم ڈبم کس نے چھوڑ دیا؟ اور حکیم جی کا تخلی بھکنے لگتا۔ حاضر کی حدیں پھلانگ کر راضی کی دنیا میں کہیں سے کہیں پہنچتا۔ گزری ہوئی باتیں اور یادیں، اور بسری داشتائیں، بھولے ہوئے لوگ، ڈور کا ایک سر امل جانا اور پھر میل کھلتی چلتی۔ طوٹے میاں کے والد عما مر سر پر رکھے، عبادوں پر ڈالے عصا ٹیکے بیچ صحمن میں کھڑے ہیں اور ستاروں کو دیکھتے ہیں۔ طوٹے میاں آم کے درخت کے پنجے بیچھے ہوئے، کبھی طوطوں کو روٹی کے ملکرے کھلاتے ہوئے کبھی اردو گرد بیچھے ہوؤں کو اپنے معز کے ساتے ہوئے۔ طاستان اور حقیقت کے درمیان وہ جو باریک سافر قہوتا ہے

دہ حکیم جی کے ذہن میں تقریباً میٹ چکا تھا۔ داستانوں اور قصوں کے جلنے کتنے منظر اور کتنے
لوگ داستانوں سے نخل کر ان کے لئے دیکھی بھالی چیزیں بن گئے تھے اور کتنے فاقعات تھے
کہ ان کے نزدیک شخص افسانے تھے۔ طوٹے میاں کے والد کو انہوں نے ہمیشہ یہ جانا کہ انہیں
اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے حالانکہ انہوں نے تو بس ان کا فصلہ طوٹے میاں سے نا تھا اور طوٹے میاں
ان کا ذکر حکیم جی یوں کرتے گویا کوئی داستان سناتے ہیں حالانکہ انہیں انہوں نے چلتے پھر تے
اور بولتے چلتے دیکھا تھا بلیے لگ لگ سے کبھی ضرور جیں ہوں گے مگر اب ہڈیوں کی مالا تھے
زگ و روپ بگڑا چکا تھا، بس آنکھوں میں دم باقی تھا۔ دُبیلے پتلے چھڑی ایسے بد زگ
گوری جلد پہ چھریاں بڑی ہو میں، بڑی بڑی اکھیں، سفید بال، عربی پتلے رکھے ہوئے لیکن میں
میں گندھے ہوئے شہر سے باہر کر بلا کے جھرے میں رہتے تھے۔ جھرے میں قیام برائے نام تھا
جھرے کے مقابل والے آم کے پیر کے نبچے بسرا م تھا۔ رات کو ستاروں کو تکتے رہنے آموں
کے دنوں میں کر بلا والے باغ میں دن بھر گوپیا گھومتی اور طوطوں کو اڑایا جاتا۔ طوطوں کی
ڈاریں گھنیٹا خون سے نخل کر سبز لمکتی دھاریاں بن کر فضنا میں پھیل جاتیں اور پھر طوٹے میاں
کے پیر پہ اتر پر پڑتیں کبھی کسی رکھواں کی بہ مجال نہ ہوئی کہ طوطوں کو اس درخت سے اڑا۔
بتی والے بہت کھانے کر آتے مگر طوٹے میاں کے حصے کا رزق اس میں کم ہوتا کچھ کر بلا
کے آس پاس پیرے ہوئے محتاجوں کو ملتا، کچھ ان سندوں کے پیٹ میں پہنچتا جو کر بلا کے
سیاہ ہوتے خستہ برجوں پر جھولتے رہتے کچھ ملکرٹنے اس کے کے پیٹ میں جاتے جو راتوں
کو کبھی باغ میں کبھی باغ سے دُور چھوٹکتا پھر تنا اور طوٹے میاں کے مراقبہ میں سخت خلل
ڈالتا۔ باقی اس جنگل کے طوطوں کا رزق نہجا۔ طوٹے میاں رات کے کھانے میں سب سے بہت
سی روٹیاں بچالیتے اور جب فخر کاتارا مخداں ہوتا تو ان بساں روٹیوں کو ہاتھ لگاتے۔
ان کے چھوٹی چھوٹی ریزے کرتے۔ یہ شغل جاری رہتا۔ یہاں تک کہ کا لوںس آسمان سے
وحلنے لگتی اور درختوں پہ دھندا دھندا اس فید غبار نظر آتا اور طوٹے قریب و دور کے درختوں

خنہ اڑاڑ کر آتے اور طوٹے میاں کے گرد چپ پھیریاں کامٹنے لگتے۔ چختے چلتے طوٹوں کی ڈاریں زمین میں بچھی ہوتیں۔ درمیان میں طوٹے میاں کھڑے ہوتے مولیٰ کے دیزے سے بھر جھر مٹی بکھرتے ہوئے! کوئی طوٹا بے قرار ہو کر ڈارے سے بچھر طوٹے میاں کے کامدھے پا آبیختا ہے اور لمبی دم اس کی طوٹے میاں کے کان کو چھو نے لگتی ہے، بچروں میں کچھ نہ پا کر پھر زمین میں پھرتے ہوئے طوٹوں میں جا شا مل ہوتا ہے۔ حکم جی کی آنکھوں کے سامنے وہ پورا منتظر آ جاتا۔ بچرا نہیں وہ دن، وہ درخت، ال د رختوں کے پرندے یاد آنے لگتے۔ طوٹے میاں کی باتیں یاد کرنے لگتیں۔ «میاں اب یہ باتیں کہاں؟» حکم جی سوچتے تو سوچتے اپنے افسر دہ ہو جاتے۔ نہ وہ لوگ رہے نہ وہ مجذیں مرد میں رہیں۔ اب تو ادمی ادمی میں غیریت ہے، پرندوں بے چاروں کی تو ہستی کیا ہے؟ چبپ، ہوجلتے پچھر ٹھنڈا سا نس بھرتے؟ ایسے طوٹا چشم ہو گئے ہیں۔ لوگ کہ کوئی مرتا ہو تو حلق میں بوند پانی کی نڈا لیں، پڑھوں میں میت پڑھی ہو تو کاندھا نہ دیں۔ «حکم جی ٹھنڈا سا نس بھر کر پھر چبپ ہو جاتے اور لمبی چبپ سادھ بیتے۔ وہ پھر کسی دور کی دنیا میں نکل جاتے۔ طوٹے میاں کا کربلا کے آس پاس پر پڑے فقروں کی خبر گیری کرنا، بیمار پڑیں تو دعا دار کرنا، درخت درخت طوٹوں کی خر لیتے پھرنا یاد آتا۔ پھر ان کے ذہن میں وہ واقعہ اُبھرنے لگتا کہ صبح ہی صبح جب طوٹے میاں طوٹوں کو روٹی کے ٹکڑے کھلانے شروع ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آم کے پر پڑتے علیں اس پودے کے نیچے جس کی ٹکھیں میں ایک طوٹے کا گھوسلہ تھا۔ طوٹا لکڑی کی طرح سخت مرا پڑا ہے۔ شاید اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ طوٹے میاں اس روذہ بہت ملوں اور بہت مصروف رہے۔ صبح ہی صبح شر کئے۔ لوگوں نے انہیں دیکھا تو بہت چیران ہوئے کہ طوٹے میاں نے آج کر بلکہ کی چیک کیوں چھوڑی اور شر کیسے آئے۔ طوٹے میاں نے اکنی اکنی دوانی دوانی بازاڑا لوں سے چندہ جمع کیا پھر لھا اور کافور خریدا۔ واپس آئے، میت کی تجھیز و تکفین کی۔ آم کے پیر ٹکڑے کے نیچے تدفین ہوئی اور طوٹے میاں نشام تک بقریہ بیٹھے قرآن خوانی کرتے رہے۔

”اس روز جب ہم رات کو ان کے پاس جا کر بیٹھے،“ حکیم جی افسر دہ لمحہ میں کہنے لگے وہ تو انہیں بہت طول پایا۔ از لسکر طبیعت بھری ہوئی تھی، اچھاری بالتوں پر بیکھنے لگے اور اپنی داستان سے بیٹھے۔ عجب طور کی داستان بھی کہ، ہم بھی طول ہو گئے۔ وہ رات ہم سبھی پر بھاری گزری“

”ہاں صاحبِ آدمی وہ عجب تھا۔“ عدالت علی بولے۔

”مگر بھائی یہ صدرے نہیں روشنی کے لوگ،“ حکیم جی نے غنی اور نصیر کی طرف اشارہ کیا۔

”انہیں تو اس کا قصد بے سر و پا نظر آئے گا۔“

عدالت علی بولے ”حکیم جی، ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ جو قصہ سچا ہوتا ہے بہت سے مرد پر لگتا ہے۔“

غنی اور نصیر نے جب بقصہ سننے پر اصرار کیا تو پھر حکیم جی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ حقیقت کے لیے گھونٹ لئے، پھر اسے مذکور اسے مذکور کرنے والے کی گردن پر حاشا و کلا میں نے اپنی طرف سے اس میں ایک لفظ شامل نہیں کیا ہے جو سنا وہ عرض کرتا ہوں، طو طے شاہ کی طبیعت میں طو طے کی موت نے گدا پیدا کر دیا تھا۔ زندگی کی ناپائیداری اور زمانے کی بے شانی کاذک کرتے کرتے انہوں نے اپنا ذکر شروع کر دیا۔

داستان طو طے میاں کی

صاحب، آج ہم خاک بسر پھرتے ہیں۔ کل ہم شہر گل کی زینت تھے۔ نازوں میں پلتے تھے۔ پھولوں میں تلتے تھے۔ اس شہر کا قصہ شیندی نی ہے کہ چشم فلک نے دنیا کے نجتے پر کام ہے کو ایسا چمن پھوٹنے دیکھا ہو گا۔ راہیں خوشبو محلے گلزار، گلیاں معین، بازار منور سے کثوار بجا تے ہیں، چھا گلیں لئے پھرتے ہیں۔ بزاری ہزاری روٹی کی گرم بازاری، دکانوں میں قیمتی اشیاء بھی ہیں، چاند نیاں بھی ہیں۔ دم کے دم میں لاکھوں کا مول ہوتا ہے مول کرنے والے دولت کو ہاتھ کا میل جانتے ہیں، مال اسباب خریدتے ہیں، ناجروں کو

مالا مال کرتے ہیں جو مال نہیں رکھتے وہ دل کا سوا اکرتے ہیں۔ دولت کی گنگا کے پہلویہ پہلو حسن کی جمنا بہتی ہے سویرے منڈھیرے چاند ایسے چھرے آنکھوں میں میھنی بیند بھرے کچھ سوتے کچھ جاتے، قدم لڑکھاتے، جمایاں لیتے، آنکھیں ملتے موج موج گھاث کی طرف جلتے ہیں۔ اشنان کی کیاشان ہے کہ گھاث پہ سونا العتما ہے، پانی کی بچھلی چاندی میں نشانے اترتے ہیں، بچھی سارٹھیوں میں کندن بدن دکتے ہیں سیمیں ساقیں ریشمیں ساعدیں دھل کر چمک مارتی ہیں۔ ہمیں سارٹھیوں کے نہرا بورا اچھل کیمیں چھپے پڑتے ہیں، کہیں چپک کر گلابی جوبنوں کو دملاتے ہیں۔ جوبنوں کے گلاب بچھوپے ہیں، گلابی عالم الگ بہار دکھاتے ہیں گھٹرے رس کے بھرے چوریکیں لے نہ سکیں۔ امی جی کازمانہ تھا صبح خیزیوں جو لوں، اچکوں کا بازار سرد تھا۔ عزت داروں کی عربت وضع داروں کی وضع قائم تھی۔

ہم جوانی کے نشے میں سرشار مسٹر گشتیاں کرتے تھے۔ کبوتر زالتے تھے۔ کیا کیا کبوتر زخم باتھا۔ جب بھرا کھا کر ملکرہی اڑتی تھی تو جانو کر گھنٹھو رکھتا اٹھتی تھی۔ صاحب، مبالغہ نہ جاننا، جب دھوپ تیزا اور گرمی سخت، موئی تھی تو والدہ حضرت فرمائیں کہ بیٹا کبوتر ذرا چھوڑ دو۔ کچا اٹا کہ خاص کبوتروں کے لئے بنوا یا تھا اس کا دروازہ کھولتا اور کبوتروں کے دل باہر پہنچھاتے یوں نکلتے کہ بادل اٹھ رہے ہیں اور دم کے دم میں آنگن میں چھاؤ ہو جاتی۔ ہوا کبھی بندہ ہوتی تو بھر والدہ حضرت فرمائیں کہ بیٹا ہوا بندہ ہے کبوتر کھولو اور جب بھر مکھتے تو جانو کر پکھے کھلتے اور بازوؤں سے وہ مٹھنڈی ہوا پیدا ہوتی کہ پسینے سے نہرا بور بدن شکفتہ ہو جاتے۔

صاحب، وہ کبوتر، ہم سے چھٹ گئے۔ لقا، لوٹن، گولا، جو گیا، متیرازی، کلامی، للسری، لقصہ طرح بڑنگ بزرگ کبوتروں سے بھرا کوٹھا اسی طرح چھوڑ آئے اور اب اپنی بچھڑ سے جدا، اپنی چھتری سے دور بھٹکتے ہیں اور اوپنجی چھتوں کو ترستے ہیں، اس آسمان کے لئے بھر طکتے ہیں۔ ہمیں دو ماچھ کا تھا۔ جاڑ سے نکی سواری جاتی تھی۔ دن اور رات

کافر قم کم ہوتا جاتا تھا۔ اے صاحبو وہ موسکوں کا ملنا اور دن اور رات کا برابر ہو وصل کرنا قیامت ہوتا ہے۔ ماہ مارچ پر غور کرو کہ کیونکہ ریبادی اور آبادی کا خیل پہلو یہ پہلو کھیلا جاتا ہے ملتے موسم کیا نیز نگی دکھاتے ہیں کہ ایک بخوبی پر شریہ بھار کی بارات چڑھی ہے۔ تاخوں نے بچوں لوں کا گھنا پہنا ہے، پتوں میں تاشابا جا جا بختا ہے۔ لبغل میں اس کے بخرا ایک دوسرا ہے، بے شربے برگ و بر، سر بر ہنہ بے ملبوس شاخیں سونے فلک تکتی ہیں اور کسی کسی نہنی سے ہلاک کوئی پتا، زرد و غمزدہ، ان ان گنت رفیقوں کو یاد کر ہاتھ ملتا ہے جو قافلہ در قافل شاخوں کی بستیوں سے رخصت ہوتے اور اب زمین کی پستی میں در بدر خاک بسرنو حرم بلب بھلکتے پھرتے ہیں اور جہاں جا پانے ہیں سر سے سر جوڑ جمع ہو ڈھیر ہو جاتے ہیں۔

ہمینہ وہ مارچ کا تھا اے صاحبو جاڑا بھی بہت ستاتھ ہے پر گلا بی جاڑا اقہر ہے کتنی کہانیاں سانحو لاتا ہے کتنی کہانیاں سانھے ہے جاتا ہے۔ بعدت دن ہوتے گزر چکی بھتی ہولی ابھی جلی بھتی اور سونے والے بند کو ٹھوں سے نکل دالانوں میں آگئے تھے۔ آہوں کے باعزوں میں ہر سکے خوشبو نیرتی رہتی اور جھوڑے مول کے بچوں کے گرد منڈلاتے مجنبھاتے رہتے۔ وہ ہمینہ مارچ کا تھا اور دن وہ نوروز کا تھا۔ دھوپ ڈھلنے لگی بھتی چھاؤں میں بچھی بھتی۔ صحن صاف، چوکی شفافت، اجلی چاندنی، اجلی چاندنی پہ اجلالا کا ویکر، والدہ ملائے نورانی چہرہ برف زنگ ریش سفید لباس، دو پلاؤ پی سر پر، عبادو ش پر، دوز انویں بھتی تھے ہاتھ میں جنتری کھلی بھتی اور سامنے ایک نسل اپنی سے بھرا کہ بڑا بچوں ایک گلاب کا پڑا اس میں تیرتا تھا۔ ایک طرف گلاب کے بچوں سے بھرا ٹشت، دوسری طرف ابھی سفید چینی کے ایک ٹشت میں یہیں کے کانٹے کا بناقلم، برابر میں چینی کی پیالی گھلے زعفران سے بھری اور برابر میں اس کے سفید کاغذ کے پُرے، بڑی کوڑی ان پہ دھری ہوئی۔ جاننا چاہیئے کہ والدہ ہمارے بڑے عامل تھے اور بخوم وجھر میں درک رکھتے تھے۔ برس کے برس بروز نوروز اسی وضع تشریف فرما ہوتے اور جب ساعت خاص

نوروز کی پہنچنی اور لگن میں تیرتا گلاب دفتا چکر کھاتا تو وہ دوز انو ہوز عفرانی روشنائی سے سفید کاغذ پر تعویز لکھتے۔

ہاں تو جنتری ان کے ہاتھ میں کھلی بخنی۔ چہرے پر نشویش کے آثار تھے جنتری دیکھتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے، نوروز کا زنگ اب کے سرخ ہے۔ ہاتھ میں نوار شیر پر سوا رائیا ہے؛ والد راجد کی زبان مبارک سے یہ کلمات سن کر دل جانے کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگا۔ مگر پھر ہم شغل سے لگ گئے زنگ کی پچکاری لئے اندر باہر نوروز کھلتے پھر تھے جو سامنے آ جاتا تھا بے دھڑک زنگ کی پچکاری اس پر چھوڑتے تھے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ ہم نے آؤ دیکھا نہ تاڈ، اس پر بھی اے صاحو، ہم یہ بتانا بھول گئے کہ جس محلے میں ہملہ اگھر تھا۔ اسی محلے میں ایک حکیم ضامن علی رہتے تھے۔ گورے چٹے، دھرا بدن۔ سدا ممل پہنتے تھے۔ ماہوں کے جاڑوں میں بھی یہی طور دیکھا کہ خالی محل کا کرتہ پہنے مطلب کرتے ہیں اور برف میں لگی کچی صراحی کا پانی پیتے تھے۔ مگر میں ان کے ایک دختر تھتی، نیک اختر، خوش ترکیب، خوش زنگ نام شہزادی محل تھا کہ وہ گورا بدن برن میں پچ پچ مرمر کا ایک محل تھا۔ قد اوپنجا بدن چھر رہا، چہرہ گلابی نقشہ کتابی، ما تھا کشادہ، آنکھیں بڑی بڑی، زلفیں گھنی گھنی سدا سفید چکن پہنتی ماسوا موسک عروج کے کہ ان ایام میں وہ شعلہ جسم سب سے پوش ہوتا اور مہماں ایسا چہرہ خوب دیکھتا۔ ساتھ کھلتے بڑے ہوئے تھے اور ایک دلیلے دلیلے ساتھ رہے تھے سودہ میان میں نہ کوئی جواب تھا نہ روک ٹوک بخنی پر فدا استغور نہ تھا کہ کیوں ساتھ کھلتے ہیں ہاں جب کھونے سے کھوا بھجو جاتا تو جی چاہتا کہ ایک بار پھر چھو جائے اور باشت سے باشت ناپتے تو پھر بار بار ناپتے اور جان کرٹے رہ کرتے کہ کس کی باشت لمبی ہے تو اس روز بھی سے شعوری ہی میں سب کچھ ہوا۔ ہم نے زنگ بھری پچکاری آؤ دیکھا نہ تاڈ اس پر چھوڑ دی وہ چہرہ زنگ سے بھیگا اور ہلکا سفید لباس شرابو ہو شکنے اور سینے سے چپکا اور گورا بدن اندر سے چھکا تو دل بہت چھکا اونچی جا پا کہ پچکاری کی دھار سکا تار جلیتی رہے اور زنگ

چھلکتا رہے کہ زمین فاً سماں اس میں بہہ جائیں پر وہ لذت ایک ساعت کی تھی کہ یہ کام نظر والد ما جدر پر پڑی جہنوں نے نظریں اٹھا کر، یہیں دیکھا اور بغیر کچھ کہے پھر جنتیں پر نظر جمالی وہ لذت اس نظر کے ساتھ بہہ گئی پس کاری مانند یہیں کھنچنی کی پچھنچ رہ گئی۔ دل سمجھنے لگا۔

اس روز سے آمد و رفت اس مہ لقا کی گھر میں ہمارے بندہ ہوئی، جی کو ہمارے روگ رکا۔

کسی کام میں دل نہ لکھا دن بھر کو عٹے پہ بیٹھا رہتا اور کبوتر اڑاتا رہتا۔ کبوتروں کے ساتھ نکلا ہیں آسمان پر بھلکتی رہتیں۔ مگر بھر آسمان بھنی ننگ ہونے لگا اور ننگ ہوتے ہوتے اپنے تیئیں مانند بھنڈے م سور کے رہ گیا۔ صاحبو آسمان ان دنوں اپنی زدیں تھاں شیب و فراز اس کی نگاہ میں تھے۔ ان دنوں آسمان نے بہت زنگ بدھے اور ستارے ان گنت لوٹے۔ رات بھرتا ہے یوں لوٹتے گویا لوپوں کے گوے چلتے ہیں اور آسمانوں میں کوئی معکرہ پڑتا ہے لگتا کہ ایک ایک کر کے ستارے چھنڈے پر ٹا جائیں گے اور دشت فلک خالی ہو کر ہو خن کرے گا۔ والدہ حضر کو زور تشویش تھی۔ ہر مرتبہ جب ستارہ ٹوٹتا تو لا حول پر ٹھیں، کانپ جاتیں اور یہ شوشاںک حلمہ زیان پر لاتیں کہ "بی بی اللہ اپنا حرم کرے۔ کچھ ہونے والا ہے، اور میرے پدر بزرگوار عصا کے کریز پچھنچنی میں کھڑے ہو جانے عصا طینکے نگاہ سوئے آسمان کے گھنٹوں ساکت و صامت کھڑے رہتے گویا چھنڈے سے ہوتے ستاروں کا شمار کرتے ہیں۔ یا باقیوں کی تعداد کرتے ہیں۔ ہیں نے ڈرتے ڈرتے ایک روز سوال کیا کہ "اے پدر بزرگوار آپ یہ کیسی چال کشی کرتے ہیں کہ رات کے ناک ایک پہلو کھڑے ستاروں کو نکتے رہتے ہیں۔ وہاں آپ کیا ویکھتے ہیں اور ستارے آپ سے کیا کہتے ہیں۔"

تب پدر نے ایک چھنڈی آہ بھری اور بولے کہ "اے پسر، جو کچھ زمین پر ہوا جاتا ہے وہ میں آسمان پر دیکھتا ہوں، ستاروں کا عالم بیکراں ہے، ان کی گردش فناز زمین وہاں ہے۔ اس زمین پر جنہے ساحل ہیں اور ساحلوں پر جنہے کنکر پتھر ہیں اتنے آسمان پر ستارے ہیں کہ مانند سفینوں کے آسمان کے سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں مگر کیا انتظام ہے کہ نہ آپس

میں مکراتے ہیں نہ برابر سے گزرتے ہیں۔ فاصلہ بخوبم کا ہر مسافر اکیلا ہے کہ بے سنگھی ساتھی یہ تو شہزادہ اور اداہ جبراں بیابانِ فلک میں بھیکتا پھرتا ہے اور گنمایم بے منزل راستوں کو طے کرتا چلا جاتا ہے کتنے مسافر ہیں کہ بیابانِ فلک میں جانے کو حرم گئے۔ مگر نشان ان کے جوں کے توں باقی ہیں اور منور خوشبوان کی اسی طرف نضامیں تیرتی ہے۔ اے جان پدر ان سدھارے ہوئے مسافروں کی منور خوشبو سے آسمانِ جمگ کرتا ہے اور زمین کے مسافروں کو کہ رات کو سفر کرتے ہیں رستہ دکھاتا ہے۔“

پدر بزرگوار کی بات بھی نے کچھ سمجھی کچھ نہ سمجھی، پر اس راہ نجیے ستارہ اپنا بادا بیا کا انکھوں سے اوچھل تھا پر منور خشبواں کی سینے کے آسمان میں تیرتی تھی اور اسے عرش منور بنائے ہوئے تھی۔ مگر سے سو باری گلی میں آنا، ادھر جانا اور جبراں ہونا اور لبٹ کر کھڑا جانا، پھر کبوتروں کے بھانے کو تھے پہ جانا اور اس بام بلند اور اس زینے کو تکتے رہنا۔ پر ہماری قسمت کے ستارے کی نو دلکشی صورت نہ ہوئی اور فلک پر ستارے اسی طور ٹوٹتے رہے اور ہمارے والد اسی وضع عصاکمر سے ٹکنے آسمان کو رات گئے تکتے رہے تا انکہ مدینہ سنبھر کا آن پہنچا مونموں کے وصال و فراق کا مدینہ صاحبو وہ تخبر ہی کی شب تھی۔ اس شب پدر بزرگوار بہت رات تک صحی میں کھڑے رہے پھر صحی سے کوئی پر جائے گئے اور اپنی منڈپ پر ہے عصاکمر کے ایک پہلو پر کھڑے ساکت و صامت دیز تک سوئے فلک دکھتے رہے۔ اس شب آسمان پر بہت کھرام چا اور ستارے کچھ تباشوں کی طرح ٹوٹے۔ پھر ایک بہت بڑا ستارہ ٹوٹا کہ چکا چوند سے اس کی سارا شہر جونک اٹھا اور سوتؤں کی آنکھیں کھل گئیں۔ پدر بزرگوار منڈپ سے اتر آئے۔ آہستہ آہستہ کتے جاتے تھے وَ تَعْزِيزُهُ مِنْ قَشْدَ وَ تَنْزِيلَ مِنْ قَشْدَ

اور زینے سے اترتے جاتے تھے۔ پھر وہ صحی سے گزر کر اپنے جھرے میں پلے گئے اور صبح تک سجدے میں پڑے رہے۔

صاحب اس رات کے بعد سے حضرت والد صاحب جھرے سے نہیں نکلے۔ سجدے اور

تلاوت قرآن ان کا وظیفہ مھٹھرا دن اور رات اسی وظیفے میں گزرتے۔ جانماز بھی ہوئی رحل تشریف پر کلام پاک رکھا ہوا اور پرے اس سے ننگی سیت ہھری ہوئی، سفید لیش آنسوؤں میں نزتر، رفت کی کیفیت طاری، زبان پر آیات قرآنی جاری۔

ایک روز عجب ہوا والدہ حضرت تڑکے سے بے آرام ہو گئیں۔ جھرے کا دروازہ جا گھٹھیا۔

پدر نے جھرے کی کندھی کھولی اور والدہ حضرت کو دیکھا کہ مثل بید کا نیتی ہیں اور انکھوں سے آنسو جاری ہیں فرمائیں «اللہ رحم کرے۔ جلالی خواب دیکھا ہے دیکھا کہ مہت لمبا جلوس ہے، اس کھلے ہوئے گریبان پھٹے ہوتے بڑا علم نکلتا ہے۔ خون اس سے ٹیکتا ہے و والدہ اجد نے تعبیر اس خواب کی کچھ نہ دی اور زبان سے کوئی حکم ارشاد نہ فرمایا۔ ٹھنڈی سانس بھری و تعر من تشاء و تزل من تشاء کہا اور پھر کلام پاک پر جاک گئے۔

والدہ حضرت ڈولی کر کر چھپوئی درگاہ پہنچیں اور ضریح کو پکڑ کر دن بھر روئی رہیں مگر پچھے نتیجہ نہ نکلا ہاں جب دونوں وقت ملتے تھے اور درگاہ میں قندیلیں روشن ہوئی تھیں تو اس جانب کو غنودگی آگئی۔ دفعنا طالپوں کی آواز کان میں آئی کہ ساری درگاہ گوش گئی اور درود یوار پر عرب و جلال طاری ہو گیا۔ والدہ حضرت ہھر بڑا کر اٹھ بیٹھیں مگر سواری گز رچیں تھیں۔ امام بارڑے کے پکے فرش پر سکم کا ایک بڑا سانشان دکھانی دے رہا تھا کہ مثل بد کے صنو دے رہا تھا۔ والدہ حضرت نے قدم مشریق کو بو سہ دیا۔ پھر بڑے علم کا پٹکا اپنی انکھوں سے مل کر بہت گری کیا اور رات پڑے مٹھن و آسودہ گھر واپس آئیں اور آرام کیا۔

صاحبہ یہ با جراستو کہ غیرے دن پھر صبح کے ہوئے میں والدہ حضرت بے آرام ہوئیں اور کان میں طالپوں کی آواز چھر آئی۔ تب انہیں تشویش ہوئی اور سوچ میں پڑیں کہ بہ بشارت ہے یا کسی آفت کی سناوی ہے۔ اس جناب نے حضرت والد صاحب کے سامنے یہ سوال ڈالا۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا یہ رموزِ الہی ہیں اور بندوں کو ان میں کلام کرنے کی لحاظت نہیں ہے۔ پھر وہ سمجھ دے یہ میں چلے گئے اور والدہ حضرت جھرے سے باہر نکل آئیں۔

اس روز شہر میں ایک کھرام پڑا۔ دیکھا کہ عجیب نہ سوار شہر میں وارد ہوا ہے کہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ بس اس کے مرکب کی ٹالاپوں کی آواز کسی کان میں آتی ہے یہ آواز نہابن جاتی ہے جو بہ آواز سنتا ہے۔ اس پر یہ جنون طاری ہوتا ہے کہ ہتھیار سمجھ کر رن کی راہ لیتا ہے عجیب آواز ہے کہ اس کا سنتے والا لوگ کے نہیں ہوتا۔ ما رو باندھو دلو چورسوں میں باندھکر رکھو گر سے ترطا اسارے بندھن توڑ ہتھیار باندھکھوڑے پہ بیٹھ پتھر کی طرح زن سے رن کو جاتا ہے۔ یوں شہر کے بہت سے جوان گھروں سے نکل گئے اور لوٹتے ہوئے رن میں گم ہو گئے۔ والدہ حضرت نے یہ خبر میں تو اور سر سید و مختار بہمویں۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک شب چھوڑ کر پھر ترطا کے کئے سے ہڑ بڑا کراچی ٹھیں اور مجھ سے فرمایا کہ میٹا سواری نکلتی ہے پھر بیدر لرزائ کی مانند کا نپنے لگیں اور ہر اس سے بولیں «کیا پڑھ جلال سواری ہے کہ درود پوار ہلتے ہیں اور ٹالاپوں کی دھمک سے گلی گلی گوئی ہے،، اس کلام سے مجھے عجیب پریشانی ہوئی اور سارے دن بیکلی و مختار بہ رہا جب نام ہوئی اور شعیں روشن ہوئیں تب میری پریشانی سوا ہوئی۔ دامنِ ضبط ہاتھ سے چھوٹا اور حضرت والد صاحب کی خدمت بایکت میں موڈب حاضر ہو یوں عرض پر دانہ ہوا کہ اے پدر بزرگوار آپ پر سے میری جاں بشار ہو۔ اجازت ہو تو بندہ ناچیز عرض کرے کہ صبح سے والدہ حضرت کی حالت غیر ہے۔ سارا گھر اداس ہے۔ ہم نے نوازا نہیں توڑا۔ والدہ حضرت کو خفغان ہوا ہے اور وہ رہ کر ٹالاپوں کی آواز یاد آتی ہے ملے پدر بزرگوار، یہ کیا اسرار الہی ہے۔ ٹالاپوں کی یہ کیسی آواز کا لون میں آتی ہے اور ہم سے کیا کہتی ہے۔۔۔

حکایت مرکب بے راکب کی

حضرت والد صاحب نے تامل کیا۔ پھر فلمشیر کو غلاف سے نکال سامنے رکھا اور گویا ہوئے۔
لے فرزند اب ہزو داپڑا ہے کہ حال اس صاحب اعجاز سواری کا ستجھ سے کھوں اور ٹالاپوں کی